وسیم بریلوی

آنکھ آنسو ہوئی

وسیم بریلوی

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

پہلی بار: اگست ۲۰۰۰

قیمت 100 روپے

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دلی ۲ میں طبع ہوئی

''شکستِ شیشۂ دل کہیں جسے''

اردو شاعری میں غم کے مضامین بہت ملتے ہیں۔ مگر اس قدر حسین غم شیریں غم جیسا کہ وسیم کی غزلوں میں ملتا ہے شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ غزلوں کی زبان بڑی سلیس دلکش اور شیریں ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بیان غم میں یہ شیرینی زبان کی ہے یا محبت کے دلدوز مضمون کی۔ یہ مٹھاس شربت کی ہے یا خون دل کی۔ ایک شاعر تو یہی محسوس کرتا ہے کہ یہ حلاوت اسی نغمے کی ہے جسے شکست شیشۂ دل، کہتے ہیں۔

وسیم کی غزلوں میں ایک رُکی تھمی سی کیفیت ملتی ہے جو ایک طویل داستان غم کا عنوان ہے ان کا غم خاموش اور گہرا ہے۔ اس کی گرفت بھی ڈھیلی ڈھالی نہیں۔ اس کے پنجے رگ جاں سے الجھے ہوئے ہیں جس سے چھوٹنا محال ہے۔ ان کے شعور میں ایک خاص قسم کی لچک ہے جو مزاج کی نرمی اور گرمی دونوں سے مل کر ترتیب پا سکی ہے۔ پھر قدرت نے ان کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا ایسا سلیقہ عطا کیا ہے جو روایات شعرو ادب کا نچوڑ ہے۔ ان سب صلاحیتوں نے مل کر ان کے بیان غم کو ایسی تاثیر اور دلکشی بخشی ہے جس کی مثال شعرائے عصر حاضر میں کمیاب یا نایاب ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمایئے۔

میں ان چراغوں کی عمرِ وفا کو روتا ہوں جو ایک شب بھی مرے دل کے ساتھ جل نہ سکے

ہم غم نصیب لوگوں کے یہ ہمسفر نہ تھے اک طنز تھے حیات پہ شام وسحر نہ تھے

آنسوؤں پر اس طرح ہنستے ہیں لوگ جیسے غم کا کوئی مستقبل نہیں

میں کچھ اس طرح جیا ہوں کہ یقین ہو گیا ہے مرے بعد زندگی کا بڑا احترام ہوگا

نشور واحدی

''انسانی حیات کے حُزنیہ پہلو کا اظہار''

غم کی تسلیم شدہ حقیقت کو میر تقی میؔر سے لے کر آج تک کے شعراء نے موضوعِ سُخن بنایا ہے۔ ہماری شاعری میں اس غم کی کہیں ہلکی اور کہیں گہری پرچھائیاں ملتی چلی آئی ہیں لیکن ہمارے اس عہد کا مفکر وسیؔم بریلوی اس داخلی غم سے سماجی اور انسانی غموں کا نشاطیہ درماں تلاش کرتا ہے۔ اُس کے یہاں وہ فنکار قلم ہے جو انسانی حیات کے حزینہ پہلو کو بھرپور تاثر کے ساتھ پیش کرنے پر قادر ہے اور اس انبساط انگیز اور حوصلہ افزا مستقبل کو جنم دینے کی سعی کرتا ہے۔ اس نے کوشش کی ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں کے چھوٹے بڑے، داخلی اور خارجی مسائل کو صرف پیش کر کے نہ چھوڑ دے بلکہ ایسا راستہ بھی دے جس پر چل کر غمزدہ انسان دائمی مسرت اور پرنور افق کو چھولے۔

شمیم کرہانی

پیکر ایثار و اعتبار

سر سے پا تک پیار ہی پیار

رفیق دیرینہ

نواب خالد خاں نیرّ

کے نام

آنکھ اکیلی خواب بہت

پھول کا درد یہ ہے کہ اُس کی خوشبو سے مہکنے والے معدوم ہو لیے تو اس کے رنگ سے اخذ حرارت کرنے والے بجھتے جاتے ہیں۔ احساس کی گلکاریاں مادّیت کی رومان کُش مسموم فضاؤں میں بے معنی سی ہو کر رہی جاتی ہیں۔ ایسے میں نزاکتِ تخیل مخاطب ہو تو کس سے؟ ہم زباں بنائے تو کسے؟۔ تین ہزار چھ سو پچاس دن بعد تحریری سطح پر پھر آپ کے روبرو ہوں۔ ۱۹۹۰ء میں ''مزاج'' کی مزاج پُرسی کا خواستگار ہوا تھا۔ آج آنکھ آنسو ہوئی کے ذریعہ درِ دل پر دستک دینا چاہتا ہوں۔

عمر کی دھوپ آنگن کے آخری پڑاؤ پر گھر سے باہر جانے کا راستہ دکھانے کے مرحلے میں ہونے کے باوجود آپ سے مکالمہ کیا چاہتی ہے۔ یعنی خود اذیتی کی بے رحم باز گشت کبھی شعر کو شعلہ بنائے دیتی ہے تو کبھی شبنمیت کا ہمنوا۔ میں نہیں جانتا کہ آپ اس شعری سفر کے آنسو نامے کو کس رنگ میں دیکھیں گے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ آپ کی ہمدرد انگلیاں زخم چھوئیں تو مرہم ہو جائیں، چوٹ سمجھیں تو شبنم لگیں۔

گزشتہ دس سال عجیب بکھراؤ کے سال رہے۔ سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تمدنی پس منظر کے لحاظ سے بڑے پر آشوب دور سے گزرے ہیں ہم لوگ۔ دولت کی ہوس لطیف احساسات کو ایسا بہائے لیے جاتی ہے کہ انسانی دردمندیاں بے معنی سی ہو گئی ہیں، بے حسی کا یہ عالم ہے کہ حادثوں کے خوف سے لکھے جانے والے اخبارات ناشتے کی میز پر پڑھے جاتے ہیں تو توسٹ پر لگے مکھن میں کمی نہیں آنے پاتی۔ اجتماعی درد بے اساس ہو کر رہ گیا ہے۔ انفرادی زندگی کے جان لیوا مسائل مادّی تگ و دو کے ہاتھوں اس درجہ خود کفیل ہو چکے ہیں کہ خود سے ہٹ کر کچھ دیکھنے یا سوچنے کا حوصلہ ہی نہیں۔ ہر کوئی خود میں یوں گم ہے کہ خود سے ہی بیگانہ ہوا جاتا ہے۔ توازن کے تصور سے بے نیاز پورا عہد رفتار کے پیچھے بھاگنے میں سرگرداں ہے۔ گھروں کی تہذیب: بڑوں کی صحبت، جو بے سمت عمروں کو سمتیں دیا کرتی تھیں قصہ پارینہ ہوئی جاتی ہیں، کبھی طاقت ور ملک عسکری جاہ و جلال کے بل پر ملک جیتتے، علاقے فتح کیا کرتے تھے مگر اب تو ذہنوں پر غلبہ کا زمانہ ہے۔ اعصاب پر اقتدار کا دور ہے، دل و دماغ غلام بنائے جا رہے ہیں اور وہ بھی افیم جیسی سستی نشہ آور لذّیت سے۔

ریموٹ ہنگامہ پرور ذہنیتوں کے ہاتھ میں ہے جو بے کس و کمزور، پس ماندہ و پژمردہ ملکوں کی نوعمر کمزوریوں سے کھیل رہے ہیں اور دولت کی ہوس پوری کرنے کا انھیں آلہ استحصال بنانے پر تُلے ہیں۔ آپ کی بات پر آپ کی نصیحت و تربیت پر جب آپ ہی کے بچے منہ پھیر کر ہنسنے لگیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ گھر بیٹھے تہذیبی جنگ ہار رہے ہیں۔ کیا عجیب بات ہے کہ اب محبت کی کوئی معصوم کہانی ہی گلی کوچوں میں تقسیم نہیں ہوتی۔ خوشبو سے پھیلتے اشارے، پھول سے کھلتے کنائے، چاند سے روشن علامتی زاویے، چاندنی سے آہستہ رو استعارے ہی شاعری کی لُغت سے باہر ہوئے۔ ''وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے'' جیسی بھینی بھینی خوشبو کی لو دیتی رومانی منظریت، تھرکتے جسموں کی حجاب سوز بازاریت کے دور میں کہاں ٹھہرے۔ محبت جیسا بے پناہ جذبہ جسمانی رشتوں کی بے راہ روی کے آگے کی بات سمجھتا ہی نہیں۔ ٹی۔ وی۔ کلچر نے ذہنوں کو اپاہج اور جسموں کو بے عمل بنا دیا ہے تو جذبوں کو بے مصرف اور آنکھوں کو بے خواب کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ کسک، وہ چبھن کہاں گئی جو خیالی داستانوں میں حقیقت کا رنگ بھر دینے کا ہنر جانتی تھی۔ وہ وسیع القلب سوزِ دروں کیا ہوا جو دوسروں کے درد میں آنسو آنسو ہو جاتا تھا۔ پھر کالیداس، پریم چند کیوں کر جنمیں؟ میر و غالب کیسے پیدا ہوں؟ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شاعری تو دردمندیوں کے حُسن کا نام ہے جب سبھی کچھ لذتِ عریاں کے عذاب میں مبتلا ہے تو اشاریت کہاں، ایمائیت کیسی؟ ادھر شاعری میں در آئی براہِ راست اخباریت اس کا زندہ ثبوت ہے۔ وہ دُکھا دُکھا لہجہ جو دل کو چھو چھو جائے اور جتنا چھوئے اُتنی ہی معنی کی پرتیں کھولتا جائے، جیسے غزل سے روٹھ ہی گیا ہو۔ سماجی ناہمواریوں کا تلخ تاثر تخلیقیت پر اس قدر حاوی ہے کہ پیار کی نغمگی پسِ پُشت جا پڑی ہے۔ ایسے میں لفظی بازی گری سے ہٹ کر واقعیت کی زمین سے جُڑے رہ کر اپنی بات اپنی ہی شرطِ اظہار کے ساتھ پیش کرنا خون تھوکنے سے کسی طرح کم نہیں۔ پچھلے دس برسوں نے کیا دیکھا اور کیا کیا دکھایا یہی سب دیکھیں اس شعری کاوش کے مختلف تیوروں میں، یہی تیور ان اشعار کی زبان میں گفتگو کریں گے۔ کبھی میری، کہیں اپنی اور کبھی آپ کی، اس گفتگو کے آئینۂ احساس میں آپ کہیں مجھے، کہیں خود کو پا سکے تو میں سمجھوں گا سب کچھ پالیا۔

وسیم بریلوی

سلیقہ ہی نہیں شاید اسے محسوس کرنے کا
جو کہتا ہے ''خدا ہے تو نظر آنا ضروری ہے''

مدینے حاضری دینے کا یہ معیار ہو جائے
وہی جائے کہ جس کو لوٹنا دشوار ہو جائے

اگست ۲۰۰۰

ذرا سا قطرہ کہیں آج اگر ابھرتا ہے
سمندروں ہی کے لہجے میں بات کرتا ہے

کھلی چھتوں کے دیئے کب کے بجھ گئے ہوتے
کوئی تو ہے جو ہواؤں کے پَر کترتا ہے

شرافتوں کی یہاں کوئی اہمیت ہی نہیں
کسی کا کچھ نہ بگاڑو تو کون ڈرتا ہے

یہ دیکھنا ہے کہ صحرا بھی ہے سمندر بھی
وہ میری تشنہ لبی کس کے نام کرتا ہے

تم آ گئے ہو تو کچھ چاندنی سی باتیں ہوں
زمیں پہ چاند کہاں روز روز اترتا ہے

زمیں کی کیسی وکالت ہو پھر نہیں چلتی

جب آسماں سے کوئی فیصلہ اترتا ہے

اس زمانے کا بڑا کیسے بنوں

اتنا چھوٹا پن مِرے بس کا نہیں

نذر کلنٹن

یہی غرور تھا اس کا وہ کیسا سورج تھا

جو اک چراغ کے ہاتھوں میں ہاتھ دے بیٹھا

محبت نا سمجھ ہوتی ہے سمجھانا ضروری ہے
جو دل میں ہے اُسے آنکھوں سے کہلانا ضروری ہے

اصولوں پر جہاں آنچ آئے ٹکرانا ضروری ہے
جو زندہ ہو تو پھر زندہ نظر آنا ضروری ہے

نئی عمروں کی خود مختاریوں کو کون سمجھائے
کہاں سے بچ کے چلنا ہے کہاں جانا ضروری ہے

تھکے ہارے پرندے جب بسیرے کے لئے لوٹیں
سلیقہ مند شاخوں کا لچک جانا ضروری ہے

بہت بیباک آنکھوں میں تعلق ٹک نہیں پاتا
محبت میں کشش رکھنے کو شرمانا ضروری ہے

سلیقہ ہی نہیں شاید اُسے محسوس کرنے کا
جو کہتا ہے ''خدا ہے تو نظر آنا ضروری ہے''

مرے ہونٹوں پہ اپنی پیاس رکھ دو اور پھر سوچو
کہ اس کے بعد بھی دُنیا میں کچھ پانا ضروری ہے

مسلسل حادثوں سے بس مجھے اتنی شکایت ہے
کہ یہ آنسو بہانے کی بھی تو مہلت نہیں دیتے

دھوپ کیا پھیلی مِری آنکھیں اکیلی ہوگئیں
صبح ہو جانے کا ارماں رات بھر اچھا لگا

میں آسماں پہ بہت دیر رہ نہیں سکتا
مگر یہ بات زمیں سے تو کہہ نہیں سکتا

کسی کے چہرے کو کب تک نگاہ میں رکھوں
سفر میں ایک ہی منظر تو رہ نہیں سکتا

یہ آزمانے کی فرصت تجھے کبھی مل جائے
میں آنکھوں آنکھوں میں کیا بات کہہ نہیں سکتا

سہارا لینا ہی پڑتا ہے مجھکو دریا کا
میں ایک قطرہ ہوں تنہا تو بہہ نہیں سکتا

لگا کے دیکھ لے جو بھی حساب آتا ہو
مجھے گھٹا کے وہ گنتی میں رہ نہیں سکتا

یہ چند لمحوں کی بے اختیاریاں ہیں وسیمؔ
گنہ سے رشتہ بہت دیر رہ نہیں سکتا

جو روشنی ہے وہ اندر سے کیا نکلتا ہے
دیئے کی لو کی طرح کانپتا نکلتا ہے

آنکھوں ہی آنکھوں میں کھو جائیں گے اندازہ نہ تھا
کون کہتا ہے کہ دل میں چور دروازہ نہ تھا

کھل کے ملنے کا سلیقہ آپ کو آتا نہیں
اور میرے پاس کوئی چور دروازہ نہیں

وہ سمجھتا تھا اسے پاکر ہی میں رہ جاؤنگا
اس کو میری پیاس کی شدت کا اندازہ نہیں

جا دکھا دنیا کو مجھکو کیا دکھاتا ہے غرور
تو سمندر ہے تو ہو میں تو مگر پیاسا نہیں

کوی بھی دستک کرے آہٹ ہویا آواز ہو
میرے ہاتھوں میں مرا گھر تو ہے دروازہ نہیں

اپنوں کو اپنا کہا چاہے کسی درجے کے ہوں
اور جب ایسا کیا میں نے تو شرمایا نہیں

اُن کی محفل میں انہیں کی روشنی جن کے چراغ
میں بھی کچھ ہوتا تو میرا بھی دیا ہوتا نہیں

تجھ سے کیا بچھڑا مری ساری حقیقت کھل گئی
اب کوی موسم ملے تو مجھ سے شرماتا نہیں

اسے تو توڑنا آتا تھا اس نے توڑ دیا
وہ جانتا ہی نہیں دل کی اہمیت کیا ہے

ہم اپنے آپ کو ایک مسئلہ بنا نہ سکے
اسی لئے تو کسی کی نظر میں آ نہ سکے

ہم آنسوؤں کی طرح واسطے نبھا نہ سکے
رہے جن آنکھوں میں ان میں ہی گھر بنا نہ سکے

پھر آندھیوں نے سکھایا وہاں سفر کا ہنر
جہاں چراغ ہمیں راستہ دکھا نہ سکے

جو پیش پیش تھے بستی بچانے والوں میں
لگی جب آگ تو اپنا بھی گھر بچا نہ سکے

مرے خدا کسی ایسی جگہ اسے رکھنا
جہاں کوئی مرے بارے میں کچھ بتا نہ سکے

تمام عمر کی کوشش کا بس یہی حاصل
کسی کو اپنے مطابق کوئی بنا نہ سکے

تسلیوں پہ بہت دن جیا نہیں جاتا
کچھ ایسا ہو کہ ترا اعتبار آ نہ سکے

وہ میرے گھر نہیں آتا میں اس کے گھر نہیں جاتا
مگر ان احتیاطوں سے تعلق مر نہیں جاتا

برے اچھے ہوں جیسے بھی ہوں سب رشتے یہیں کے ہیں
کسی کو ساتھ دنیا سے کوئی لیکر نہیں جاتا

گھروں کی تربیت کیا آ گئی ٹی۔وی کے ہاتھوں میں
کوئی بچہ اب اپنے باپ کے اوپر نہیں جاتا

کھلے تھے شہر میں سو در مگر اک حد کے اندر ہی
کہاں جاتا اگر میں لوٹ کے پھر گھر نہیں جاتا

محبت کے یہ آنسو ہیں انہیں آنکھوں میں رہنے دو
شریفوں کے گھروں کا مسئلہ باہر نہیں جاتا

وسیم اس سے کہو دنیا بہت محدود ہے میری
کسی در کا جو ہو جائے وہ پھر در در نہیں جاتا

چلو ہم ہی پہل کر دیں کہ ہم سے بدگماں کیوں ہو
کوئی رشتہ ذرا سی ضد کی خاطر رائیگاں کیوں ہو

میں زندہ ہوں تو اس زندہ ضمیری کی بدولت ہی
جو بولے تیرے لہجے میں بھلا میری زباں کیوں ہو

سوال آخر یہ اک دن دیکھنا ہم ہی اٹھائیں گے
نہ سمجھے جو زمیں کے غم وہ اپنا آسماں کیوں ہو

ہماری گفتگو کی اور بھی سمتیں بہت سی ہیں
کسی کا دل دکھانے ہی کو پھر اپنی زباں کیوں ہو

بکھر کر رہ گیا ہم سائیگی کا خواب ہی ورنہ
دیئے اس گھر میں روشن ہوں تو اُس گھر میں دھواں کیوں ہو

محبت آسماں کو جب زمیں کرنے کی ضد ٹھری
تو پھر بزدل اصولوں کی شرافت درمیاں کیوں ہو

امیدیں ساری دنیا سے وسیمؔ اور خود میں ایسے گم
کسی پہ کچھ نہ ظاہر ہو تو کوئی مہرباں کیوں ہو

کیا دکھ ہے سمندر کو بتا بھی نہیں سکتا
آنسو کی طرح آنکھ تک آ بھی نہیں سکتا

تو چھوڑ رہا ہے تو خطا اس میں تری کیا
ہر شخص مرا ساتھ نبھا بھی نہیں سکتا

پیاسے رہے جاتے ہیں زمانے کے سوالات
کس کے لئے زندہ ہوں بتا بھی نہیں سکتا

گھر ڈھونڈ رہے ہیں مرا راتوں کے پجاری
میں ہوں کہ چراغوں کو بجھا بھی نہیں سکتا

ویسے تو اک آنسو ہی بہا کر مجھے لے جائے
ایسے کوئی طوفان ہلا بھی نہیں سکتا

کہاں ثواب کہاں کیا عذاب ہوتا ہے
محبتوں میں کب اتنا حساب ہوتا ہے

بچھڑ کے مجھ سے تم اپنی کشش نہ کھو دینا
اداس رہنے سے چہرہ خراب ہوتا ہے

اسے پتہ ہی نہیں ہے کہ پیار کی بازی
جو ہار جائے وہی کامیاب ہوتا ہے

جب اس کے پاس گنوانے کو کچھ نہیں رہتا
تو کوئی آج کا عزت مآب ہوتا ہے

جسے میں لکھتا ہوں ایسے کہ خود ہی پڑھ پاؤں
کتابِ زیست میں ایسا بھی باب ہوتا ہے

بہت بھروسہ نہ کر لینا اپنی آنکھوں پر
دکھائی دیتا ہے جو کچھ وہ خواب ہوتا ہے

میں جیسے چاہوں جیوں میری زندگی ہے میاں
تمہیں سلیقہ سکھانے کی کیا پڑی ہے میاں

کسی سے بچھڑو تو یہ سوچ کر بچھڑ جانا
تعلقات سے یہ زندگی بڑی ہے میاں

تمہاری سوچوں کے اکثر خلاف ہوتا ہے
تمہارے بارے میں دنیا جو سوچتی ہے میاں

اس انتظار میں کیوں ہو وہ لوٹ آئے گا
تمہارے پیار میں شاید کوئی کمی ہے میاں

بچھڑ گئے تو کسی روز مل بھی جاؤ گے
یہ دنیا ایسی کہاں کی بہت بڑی ہے میاں

حد سے بڑھ کے تعلق بنھایا نہیں
میں نے اتنا بھی خود کو گنوایا نہیں

جاتے جاتے مجھے کیسا حق دے گیا
وہ پرایا بھی ہو کے پرایا نہیں

پیار کو چھوڑ کے باقی ہر کھیل میں
جتنا کھونا پڑا اتنا پایا نہیں

واپسی کا سفر کتنا دشوار تھا
چاہ کر بھی اسے بھول پایا نہیں

عمر ساری تماشوں میں گذری مگر
میں نے خود کو تماشا بنایا نہیں

زندگی کا یہ لمبا سفر اور وسیمؔ
جیب میں دو قدم کا کرایہ نہیں

تجھے پانے کی کوشش میں کچھ اتنا کھو چکا ہوں میں
کہ تو مِل بھی اگر جائے تو اب ملنے کا غم ہوگا

تعلق توڑ دو لیکن مجھے اتنا تو بتلادو
کہ اس کے بعد دنیا میں مِری پہچان کیا ہوگی

اداس ایک مُجھی کو تو کر نہیں جاتا
وہ مجھ سے روٹھ کے اپنے بھی گھر نہیں جاتا

وہ دن گئے کہ محبت تھی جان کی بازی
کسی سے اب کوئی بچھڑے تو مر نہیں جاتا

تمہارا پیار تو سانسوں میں سانس لیتا ہے
جو ہوتا نشہ تو اک دن اُتر نہیں جاتا

پرانے رشتوں کی بے غرضیاں[1] نہ سمجھے گا
وہ اپنے عہدے سے جب تک اُتر نہیں جاتا

وسیم اس کی تڑپ ہے تو اس کے پاس چلو
کبھی کنواں کسی پیاسے کے گھر نہیں جاتا

1۔ضرورتِ شعری

تو بھی بکھرنا سیکھ لے اپنے جسم کی پاگل خوشبو سے
میں بھی ہوا جاتا ہوں باہر اندیشوں کے قابو سے

میرا کہلانے کا مطلب یہ تو نہیں تو میرا ہو
تیرا میرا رشتہ جیسے پھول کا رشتہ خوشبو سے

سنگ اٹھاؤ سنگ کہ دیکھو پتھر ہے پتھر کا جواب
قلعے ڈھانے نکلے ہو اور وہ بھی لرزتے آنسو سے

شاہوں نے بھی شاہی چھوڑ کے پیار کیا تو پیار ملا
دل کی زمینیں جیت نہ پایا کوئی بھی زورِ بازو سے

فطرت ہی آزاد ہو جسکی اس کا درد نہیں جاتا
میں نے تو بس یہ چاہا اپنی مٹھی بھر لوں خوشبو سے

آنکھیں زخمی ہیں تو وسیمؔ اب شکوہ اور شکایت کیا
تم نے بھی تو دیکھنا چاہا دنیا کو ہر پہلو سے

انا کو دفن کر دوں قتل سب خودداریاں کر دوں
ٹھہر اے زندگی تیرے لئے آسانیاں کر دوں

پہرے لگے ہوئے ہیں مری صبح و شام پر
میں مارا جا رہا ہوں بزرگوں کے نام پر

سوچیں تو خود سے شرمائیں
کس کے ہیں کس کے کہلائیں

آنکھ میں ہوں آنسو کہلائیں
گھر چھوٹے مٹی ہو جائیں

کچھ باتوں کا حسن یہی ہے
دل میں رہیں ہونٹوں پہ نہ آئیں

عمر ہی کتنی ان رنگوں کی
کیسے تری تصویر بنائیں

اور ابھی کچھ دھوکے دے لو
جانے کب آنکھیں کھل جائیں

تم سے ملنے کو چہرے بنانا پڑے
کیا دکھائیں جو دل بھی دکھانا پڑے

غم کے گھر تک نہ جانے کی کوشش کرو
جانے کس موڑ پر مسکرانا پڑے

آگ ایسی لگانے سے کیا فائدہ
جس کے شعلوں کو خود ہی بجھانا پڑے

کل کا وعدہ نہ لو کون جانے کہ کل
کس کو چاہوں کسے بھول جانا پڑے

کھو نہ دینا کہیں ٹھوکروں کا حساب
جانے کس کس کو رستہ بتانا پڑے

ایسے بازار میں آئے ہی کیوں وسیم

اپنی بولی جہاں خود لگانا پڑے

بجھتے ہیں تو بجھ جائیں کوئی غم نہیں کرتے

ہم اپنے چراغوں کی لویں کم نہیں کرتے

میں جن دنوں ترے بارے میں سوچتا ہوں بہت

اُنہیں دنوں تو یہ دنیا سمجھ میں آتی ہے

خواب دیکھوں خواب سی تعبیر ہو سکتی نہیں
جو بدل جائے مری تقدیر ہو سکتی نہیں

میری جانب ہوں نگاہیں دل میں کوئی اور ہو
اتنی لاپروا تری تصویر ہو سکتی نہیں

روندتے جاتے ہو رشتے توڑتے جاتے ہو دل
اس طرح تو کوئی بھی تعمیر ہو سکتی نہیں

کچھ بھی سننے کے لئے راضی نہیں ہیں سامعین
آج جلسے میں کوئی تقریر ہو سکتی نہیں

میں مخاطب ہوں تو میرا نام بھی ہوگا کہیں
اس قدر بے ربط یہ تحریر ہو سکتی نہیں

دیئوں کا قد گھٹانے کے لئے راتیں بڑی کرنا
بڑے شہروں میں رہنا ہو تو پھر باتیں بڑی کرنا

محبت کے گھروں کے کچے پن کو یہ کہاں سمجھیں
ان آنکھوں کو تو بس آتا ہے برساتیں بڑی کرنا

محبت میں بچھڑنے کا ہنر سب کو نہیں آتا
کسی کو چھوڑنا ہو تو ملاقاتیں بڑی کرنا

رات کے ہاتھ سے دن نکلنے لگے
جائیدادوں کے مالک بدلنے لگے

ایک افواہ سب رونقیں لے گئی
دیکھتے دیکھتے شہر جلنے لگے

میں تو کھویا رہوں گا ترے پیار میں
تو ہی کہہ دینا جب تو بدلنے لگے

سوچنے سے کوئی راہ ملتی نہیں
چل دیے ہیں تو رستے نکلنے لگے

چھین لیں شہرتوں نے سب آزادیاں
راہ چلتوں سے رشتے نکلنے لگے

جو ملا اس کو تعلق کا گماں رہنے دیا
اس نے میرا خواب میرا ہی کہاں رہنے دیا

دشمنِ تہذیب مشرق اور کیا چاہے گا تو
ہم نے ٹی۔وی کو کھلا وقتِ اذاں رہنے دیا

کاہے کی بحثیں میاں وہ ہم ہوئے یا تم ہوئے
کس نے یہ ہندوستاں ہندوستاں رہنے دیا

اک دیے کا چہرہ کوئی دوسرا پڑھنے نہ پائے
گھر کے آنگن میں کسی نے وہ دھواں رہنے دیا

میں بنانا چاہتا تھا جس کو غالب کی غزل
تم نے اس بستی میں میرا گھر کہاں رہنے دیا

قطرہ ہوں اپنی حد سے گذرتا نہیں
میں سمندر کو بدنام کرتا نہیں

تو اگر ایک حد سے گذرتا نہیں
میں بھی اپنی حدیں پار کرتا نہیں

اپنی کم ہمتی کو دعا دیجیے
پَر کسی کے کوئی یوں کترتا نہیں

جانے کیا ہو گئی اس کی معصومیت
اب یہ بچہ دھماکوں سے ڈرتا نہیں

بس زمیں سے جُڑی ہیں سبھی رونقیں
آسماں سے کوئی گھر اُترتا نہیں

کیا بتاؤں کیسا خود کو دربدر میں نے کیا
عمر بھر کس کس کے حصّے کا سفر میں نے کیا

تو تو نفرت بھی نہ کر پائے گا اس شدّت کے ساتھ
جس بلا کا پیار تجھ سے بے خبر میں نے کیا

کیسے بچوں کو بتاؤں راستوں کے پیچ و خم
زندگی بھر تو کتابوں کا سفر میں نے کیا

کس کو فرصت تھی کہ بتلاتا تجھے اتنی سی بات
خود سے کیا برتاؤ تجھ سے چھوٹ کر میں نے کیا

چند جذباتی سے رشتوں کے بچانے کو وسیمؔ
کیسا کیسا جبر اپنے آپ پر میں نے کیا

حویلیوں میں مری تربیت نہیں ہوتی
تو آج سر پہ ٹپکنے کو چھت نہیں ہوتی

ہمارے گھر کا پتہ پوچھنے سے کیا حاصل
اداسیوں کی کوئی شہریت نہیں ہوتی

چراغ گھر کا ہو محفل کا ہو کہ مندر کا
ہوا کے پاس کوئی مصلحت نہیں ہوتی

ہمیں جو خود میں سمٹنے کا فن نہیں آتا
تو آج ایسی تری سلطنت نہیں ہوتی

وسیم شہر میں سچائیوں کے لب ہوتے
تو آج خبروں میں سب خیریت نہیں ہوتی

پیار کو اک پہیلی بنانے لگے
تم تو آنکھوں سے آنسو چھپانے لگے

ہم بھی کیا تھے کہ اک دوستی کیا گئی
راہ چلتوں کو دشمن بنانے لگے

دم دیئوں میں نہ دیکھا تو ایسے بھی تھے
آندھیوں سے تعلق بڑھانے لگے

سچ کی چپ مصلحت کی زباں کیا ہوئی
قطرے خود کو سمندر بتانے لگے

عمر بچوں سی ضد کر رہی ہے وسیمؔ
کوئی آئے کہانی سنانے لگے

حادثوں کی زد پہ ہیں تو مسکرانا چھوڑ دیں
زلزلوں کے خوف سے کیا گھر بنانا چھوڑ دیں

تم نے میرے گھر نہ آنے کی قسم کھائی تو ہے
آنسوؤں سے بھی کہو آنکھوں میں آنا چھوڑ دیں

پیار کے دشمن کبھی تو پیار سے کہہ کے تو دیکھ
ایک تیرا در ہی کیا ہم تو زمانہ چھوڑ دیں

گھونسلے ویران ہیں اب وہ پرندے ہی کہاں
اک بسیرے کے لئے جو آب و دانہ چھوڑ دیں

دیوار سمجھتی ہے کہ ڈر کر نہ سکوں گا
ہمت ہے تو کیا معرکہ سر کر نہ سکوں گا

لینا ہے مجھے ساتھ تو میرا بھی بھرم رکھ
میں تیرے ارادوں سے سفر کر نہ سکوں گا

اب کے وہ دبے پاؤں چلی آتی ہے آندھی
لگتا ہے چراغوں کو خبر کر نہ سکوں گا

میرے ترے رشتے میں دراریں ہیں کچھ ایسی
چاہوں بھی تو دل میں ترے گھر کر نہ سکوں گا

جب اپنی سانس ہی در پردہ ہم پہ وار کرے
تو پھر جہاں میں کوئی کس پہ اعتبار کرے

وفا کی راہ میں کتنے ہی موڑ ائیں گے
بتا یہ عمر کہاں تیرا انتظار کرے

ہر ایک اپنے لئے میرے زخم گنتا ہے
مرے لئے بھی کوئی ہو جو مجھ سے پیار کرے

بہت دنوں میں زمانے کی ٹھوکروں میں رہا
کہو زمانے سے اب میرا انتظار کرے

سب اپنی پیاس میں گم ہیں یہاں تو اے ساقی
کوئی نہیں جو تیرے میکدے سے پیار کرے

میں بجھا میرا گھر جگمگاتا رہا
کچھ لگا بھی تو ہو کچھ بھی جاتا رہا

زندگی نے کچھ ایسے لئے امتحاں
موت کا خوف تھا وہ بھی جاتا رہا

ماننے کو یہاں کون تیار تھا
لاکھ میں اپنے رشتے بتاتا رہا

اب تو سمجھوتہ کرتے بنے گی وسیم
آپ کے ہاتھ سے وقت جاتا رہا

رنگ بے رنگ ہوں خوشبو کا بھروسہ جائے
میری آنکھوں سے جو دنیا تجھے دیکھا جائے

ہم نے جس راہ کو چھوڑا پھر اسے چھوڑ دیا
اب نہ جائیں گے ادھر چاہے زمانہ جائے

میں نے مدت سے کوئی خواب نہیں دیکھا ہے
ہاتھ رکھ دے مری آنکھوں پہ کہ نیند آ جائے

میں گناہوں کا طرفدار نہیں ہوں پھر بھی
رات کو دن کی نگاہوں سے نہ دیکھا جائے

کچھ بڑی سوچوں میں یہ سوچیں بھی شامل ہیں وسیم
کسی بہانے کوئی شہر جلایا جائے

کچھ اتنا خوف کا مارا ہوا بھی پیار نہ ہو
وہ اعتبار دلائے اور اعتبار نہ ہو

ہوا خلاف ہو موجوں پہ اختیار نہ ہو
یہ کیسی ضد ہے کہ دریا کسی سے پار نہ ہو

میں گاؤں لوٹ رہا ہوں بہت دنوں کے بعد
خدا کرے کہ اسے میرا انتظار نہ ہو

ذرا سی بات پہ گھٹ گھٹ کے صبح کر دینا
مری طرح بھی کوئی میرا غمگسار نہ ہو

دکھی سماج میں آنسو بھرے زمانے میں
اسے یہ کون بتائے کہ اشکبار نہ ہو

گناہگاروں پہ انگلی اٹھائے دیتے ہو
وسیمؔ آج کہیں تم بھی سنگسار نہ ہو

پتنگ جیسا یہ اُڑنا بھی کوئی اُڑنا ہے
کہ اُڑ رہے ہیں مگر دوسروں کے ہاتھ میں ہیں

اُس نے کیا لاج رکھی ہے مری گمراہی کی
کہ میں بھٹکوں تو بھٹک کر بھی اُسی تک پہنچوں

وہ بے حسی کے دن آئے کہ کچھ ہوا نہ لگا
کب اس کو بھول گئے یہ بھی تو پتا نہ لگا

بچھڑتے وقت دلاسے نہ کھوکھلے وعدے
وہ پہلی بار مجھے آج بیوفا نہ لگا

جہاں پہ دستکیں پہچان کر جواب ملے
گذر بھی ایسے مکاں سے ہو تو صدا نہ لگا

یہ دیکھنے کا سلیقہ بھی کس کو آتا ہے
کہ اس نے دیکھا مجھے اور دیکھتا نہ لگا

وسیمؔ اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھا
تو اپنے چاروں طرف کوئی بھی برا نہ لگا

میری دھوپوں کے سر کو ردا کون دے
نیند میں یہ مجھے پھول سا کون دے

خود چلو تو چلو آسرا کون دے
بھیڑ کے دور میں راستہ کون دے

ظلم کس نے کیا کون مظلوم تھا
سب کو معلوم ہے پھر بتا کون دے

یہ زمانہ اکیلے مسافر کا ہے
اس زمانے کو پھر رہنما کون دے

اپنے آگے کسی کو سمجھتا نہیں
اس کے ہاتھوں میں اک آئینہ کون دے

دل سبھی کا دکھا ہے مگر اے وسیمؔ
دیکھنا ہے اسے بددعا کون دے

یہ نفرت ہے جسے لمحوں میں دنیا جان لیتی ہے
محبت کا پتہ لگتے زمانے بیت جاتے ہیں

زمیں تو جیسی ہے ویسی ہی رہتی ہے لیکن
زمیں کو بانٹنے والے بدلتے رہتے ہیں

وہ پیار جس کے لئے ہم نے کیا گنوا نہ دیا
اسی نے بچ کے نکلنے کا راستہ نہ دیا

کوئی نظر میں رہا بھی تو اس سلیقے سے
کہ میں نے اس کے ہی گھر کا اسے پتہ نہ دیا

جب ایک بار جلا لیں ہتھیلیاں اپنی
تو پھر خدا نے بھی اس ہاتھ میں دِیا نہ دیا

یہ گمرہی کا بھی نشہ عجیب تھا ورنہ
گناہگار نہ رستہ نہ فاصلہ نہ دیا

زباں سے دل کے سبھی فیصلے نہیں ہوتے
اسے بھلانے کو کہتے تو تھے بھلا نہ دیا

وسیمؔ اس کے ہی گھر اور اس پہ ہی تنقید
یہی بہت ہے کہ اس نے تمہیں اٹھا نہ دیا

اپنے انداز کا اکیلا تھا
اس لئے میں بڑا اکیلا تھا

پیار تو جنم کا اکیلا تھا
کیا میرا تجربہ اکیلا تھا

ساتھ تیرا نہ کچھ بدل پایا
میرا ہی رُاستہ اکیلا تھا

بخشش بے حساب کے آگے
میرا دستِ دُعا اکیلا تھا

تیری سمجھوتے باز دُنیا میں
کون میرے سوا اکیلا تھا

جو بھی ملتا گلے لگا لیتا
کس قدر آئینہ اکیلا تھا

ویسے تو سیاہی کے ہاتھوں یہ رات پہیلی ہوتی ہے
تم کتنے دکھائی دیتے ہو جب آنکھ اکیلی ہوتی ہے

دکھائی بھی نہیں دیتی بیاں بھی ہو نہیں سکتی
کسی کی زندگی میں کچھ کمی ایسی بھی ہوتی ہے

وہ جو ہر آنکھ کو پیمانہ نظر آئے ہے
مجھ سے ملتی ہے وہی آنکھ تو بھر آئے ہے

کوئی ساتھی نہ کوئی راہ نہ سمتِ منزل
زندگی میں ہی اک ایسا بھی سفر آئے

لوٹتا ہوں تو سلیقے سے سجا ملتا ہے
میرے پیچھے کوئی جیسے مرے گھر آئے ہے

زندگی پھول سے نازک ہے مگر خوابوں کی
آنکھ سے دیکھو تو کانٹا سی نظر آئے ہے

انتظار ایک سفر ہے کہ جو ہو ختم تو پھر
رات آکاش سے آنکھوں میں اُتر آئے ہے

منحصر اب تو اسی آس پہ جینا ہے وسیمؔ
رات کے بعد سنا ہے کہ سحر آئے ہے

یہ سوچ کر کہ مِری شخصیت نہ دب جائے
میں اس کے ساتھ بہت دیر تک نہیں رہتا

جائدادیں کہاں بٹیں ان میں
جائدادوں میں بٹ گئے بھائی

جیتے ہیں کردار نہیں ہے

ناؤ تو ہے پتوار نہیں ہے

میرا غم منجدھار نہیں ہے

غم ہے کوئی اس پار نہیں ہے

کھونا پانا میں کیا جانوں

پیار ہے کاروبار نہیں ہے

سجدہ وہاں اک سر کی ورزش

سر پہ جہاں تلوار نہیں ہے

ذہنوں میں دیوار نہ ہو تو

ملنا کوئی دشوار نہیں ہے

ق

میں بھی کچھ ایسا دور نہیں ہوں
تو بھی سمندر پار نہیں ہے

پہلے تولو پھر کچھ بولو
لفظ کوئی بیکار نہیں ہے

میں سب سے جھک کر ملتا ہوں
میری کہیں بھی ہار نہیں ہے

اپنے سائے کو اتنا سمجھانے دے
مجھ تک میرے حصّے کی دھوپ آنے دے

ایک نظر میں کئی زمانے دیکھے تو
بوڑھی آنکھوں کی تصویر بنانے دے

بابا دنیا جیت کے میں دکھلادونگا
اپنی نظر سے دور تو مجھ کو جانے دے

میں بھی تو اس باغ کا ایک پرندہ ہوں
میری ہی آواز میں مجھکو گانے دے

پھر تو یہ اونچا ہی ہوتا جائے گا
بچپن کے ہاتھوں میں چاند آجانے دے

فصلیں پک جائیں تو کھیت سے بچھڑیں گی
روتی آنکھ کو پیار کہاں سمجھانے دے

آواز کا لبوں سے بہت فاصلہ نہ تھا
لیکن وہ خوف تھا کہ کوئی بولتا نہ تھا

آنسو کو اعتبار کے قابل سمجھ لیا
میں خود ہی چھوٹا نکلا ترا غم بڑا نہ تھا

اس نے ہی مجھ کو دیکھا زمانے کی آنکھ سے
جس کو مری نظر سے کوئی دیکھتا نہ تھا

اُن اجنبیتوں کے کے ستائے ہیں ان دنوں
جیسے کبھی کسی سے کوئی واسطہ نہ تھا

ہر موڑ پر امید تھی ہر سوچ آرزو
خود سے فرار کا بھی کوئی راستہ نہ تھا

اپنا یہ المیہ[1] ہے کہ ہم ذہنی طور پر
اس شہر میں رہے جو ابھی تک بسا نہ تھا

کیسی گراوٹوں پہ کھڑی تھیں مگر وسیمؔ
اونچی عمارتوں سے کوئی پوچھتا نہ تھا

1۔ضرورتِ شعری

تمہاری راہ میں مٹی کے گھر نہیں آتے
اسی لئے تو تمہیں ہم نظر نہیں آتے

محبتوں کے دنوں کی یہی خرابی ہے
یہ روٹھ جائیں تو پھر لوٹ کر نہیں آتے

جنھیں سلیقہ ہے تہذیبِ غم سمجھنے کا
انھیں کے رونے میں آنسو نظر نہیں آتے

خوشی کی آنکھ میں آنسو کی بھی جگہ رکھنا
بُرے زمانے کبھی پوچھ کر نہیں آتے

بساطِ عشق پہ بڑھنا کسے نہیں آتا
مگر ہر ایک کو بچنے کے گھر نہیں آتے

وسیم ذہن بناتے ہیں تو وہی اخبار
جو لے کے ایک بھی اچھی خبر نہیں آتے

سفر مشکل سہی لیکن مِری ہمّت یہ کہتی ہے
اکیلا چل دیا ہوں میں اکیلا رہ نہیں سکتا

میں غمِ دوریٔ منزل مِری دن بھر کی تھکن
کون دیکھے گا مِری شامِ سفر کیسی ہے

ہمارا عزمِ سفر کب کدھر کا ہوجائے
یہ وہ نہیں جو کسی رہگذر کا ہو جائے

اسی کو جینے کا حق ہے جو اس زمانے میں
اِدھر کا لگتا رہے اور اُدھر کا ہو جائے

کھلی ہواؤں میں اڑنا تو اس کی فطرت ہے
پرندہ کیوں کسی شاخِ شجر کا ہوجائے

میں لاکھ چاہوں مگر ہو تو یہ نہیں سکتا
کہ تیرا چہرہ مری ہی نظر کا ہو جائے

مِرا نہ ہونے سے کیا فرق اس کو پڑنا ہے
پتہ چلے جو کسی کم نظر کا ہوجائے

وسیم صبح کی تنہائی سفر سوچو
مشاعرہ تو چلو رات بھر کا ہوجائے

راستوں میں بھی تو لٹنے کی روایت ہے وسیم
ہر مسافر کی یہ منزل پہ نظر کیسی ہے

نظر بچانے کا فن بھی تمہیں کو آتا ہے
مگر تمہاری طرح کوئی دیکھتا بھی نہیں

اب ایسا گھر کے دریچوں کو بند کیا رکھنا
ہوا کے آنے کا کوئی تو راستہ رکھنا

تعلقات کبھی ایک سے نہیں رہتے
اسے گنوا کے بھی جینے کا حوصلہ رکھنا

جب اپنے لوگ ہی آئیں گے لوٹنے کے لئے
تو دوستی کا تقاضہ ہے گھر کھلا رکھنا

یہ قربتیں ہی بڑے امتحان لیتی ہیں
کسی سے واسطہ رکھنا تو دور کا رکھنا

تمام جھگڑے یہاں ملکیت کے ہوتے ہیں
کہیں بھی رہنا مگر گھر کرائے کا رکھنا

بڑے بڑوں کو یہاں ہاتھ تاپنا ہوں گے
جلے مکانوں کو کچھ دن یوں ہی جلا رکھنا

وسیمؔ دلّی کی سڑکوں پہ رات بھاری ہے
سرہانے میرؔ کا دیوان ہی کھلا رکھنا

دکھ اپنا اگر ہم کو بتانا نہیں آتا
تم کو بھی تو اندازہ لگانا نہیں آتا

پہنچا ہے بزرگوں کے بیانوں سے جو ہم تک
کیا بات ہوئی کیوں وہ زمانہ نہیں آتا

میں بھی اسے کھونے کا ہنر سیکھ نہ پایا
اس کو بھی مجھے چھوڑ کے جانا نہیں آتا

اس چھوٹے زمانہ کے بڑے کیسے بنوگے
لوگوں کو جب آپس میں لڑانا نہیں آتا

ڈھونڈے ہے تو پلکوں پہ چمکنے کے بہانے
آنسو کو مری آنکھ میں آنا نہیں آتا

تاریخ کی آنکھوں میں دھواں ہو گئے خود ہی
تم کو تو کوئی گھر بھی جلانا نہیں آتا

ہمارا دل بھی تھا دنیا میں روشنی بانٹیں
مگر چراغ سا جلنا ہمیں نہیں آیا

غم بیاں کرنے کا کوئی اور ڈھنگ ایجاد کر
تیری آنکھوں کا یہ پانی تو پُرانا ہوگیا

اپنے چہرے سے جو ظاہر ہے چھپائیں کیسے
تیری مرضی کے مطابق نظر آئیں کیسے

گھر سجانے کا تصور تو بہت بعد کا ہے
پہلے یہ طے ہو کہ اس گھر کو بچائیں کیسے

لاکھ تلواریں بڑھی آتی ہوں گردن کی طرف
سر جھکانا نہیں آتا تو جھکائیں کیسے

قہقہہ آنکھ کا برتاؤ بدل دیتا ہے
ہنسنے والے تجھے آنسو نظر آئیں کیسے

پھول سے رنگ جدا ہونا کوئی کھیل نہیں
اپنی مٹی کو کہیں چھوڑ کے جائیں کیسے

کوئی اپنی ہی نظر سے تو ہمیں دیکھے گا
ایک قطرے کو سمندر نظر آئیں کیسے

جس نے دانستہ کیا ہو نظر انداز وسیمؔ
اس کو کچھ یاد دلائیں تو دلائیں کیسے

کیسا دریا ہے کہ پیاسا تو نہ مرنے دے گا
اپنی گہرائی کا اندازہ نہ کرنے دے گا

خاکِ پا ہو کے ملو جس سے ملو پھر دیکھو
اس بلندی سے تمہیں کون اترنے دے گا

پیار تہذیب تعلق کا عجب بندھن ہے
کوئی چاہے تو حدیں پار نہ کرنے دے گا

ڈوب جانے کو جو تقدیر سمجھ بیٹھے ہوں
ایسے لوگوں میں مجھے کون ابھرنے دے گا

سب سے جیتی بھی رہے سب کی چہیتی بھی رہی
زندگی ایسے تجھے کون گذرنے دے گا

دل کو سمجھاؤ کہ بیکار پریشاں ہے وسیمؔ
اپنی من مانی اسے کوئی نہ کرنے دے گا

وہ جاتے جاتے کچھ ایسے لگا گیا تالے
کہ میرے ذہن میں اب کوئی در نہیں کھلتا

ستم کے ہاتھ پہ بیعت تو ہو نہیں سکتی
اب امتحاں کی گھڑی ہے تو ٹال دیں کیسے

ق

جو ہوتا پاؤں میں کانٹا نکال سکتے تھے
کسی کے ذہن کا کانٹا نکال دیں کیسے

سبھی کا دھوپ سے بچنے کو سر نہیں ہوتا
ہر آدمی کے مقدر میں گھر نہیں ہوتا

کبھی لہو سے بھی تاریخ لکھنی پڑتی ہے
ہر ایک معرکہ باتوں سے سر نہیں ہوتا

میں اس کی آنکھ کا آنسو نہ بن سکا ورنہ
مجھے بھی خاک میں ملنے کا ڈر نہیں ہوتا

مجھے تلاش کروگے تو پھر نہ پاؤگے
میں اک صدا ہوں صداؤں کا گھر نہیں ہوتا

ہماری آنکھ کے آنسو کی اپنی دنیا ہے
کسی فقیر کو شاہوں کا ڈر نہیں ہوتا

قلم اٹھائے مرے ہاتھ تھک گئے پھر بھی
تمہارے گھر کی طرح میرا گھر نہیں ہوتا

میں اس مکان میں رہتا ہوں اور زندہ ہوں
وسیمؔ جس میں ہوا کا گذر نہیں ہوتا

قطرہ اب احتجاج کرے بھی تو کیا ملے
دریا جو لگ رہے تھے سمندر سے جا ملے

ہر شخص دوڑتا ہے یہاں بھیڑ کی طرف
پھر یہ بھی چاہتا ہے اسے راستہ ملے

اس آرزو نے اور تماشہ بنادیا
جو بھی ملے ہماری طرف دیکھتا ملے

دنیا کو دوسروں کی نظر سے نہ دیکھئے
چہرے نہ پڑھ سکے تو کتابوں میں کیا ملے

رشتوں کو بار بار سمجھنے کی آرزو
کہتی ہے پھر ملے تو کوئی بیوفا ملے

اس دورِ منصفی میں ضروری نہیں وسیمؔ
جس شخص کی خطا ہو اسی کو سزا ملے

پانے والے بھی یہاں کیا نہ گنوائے ہونگے
جسم مل جائے تو احساس پرائے ہونگے

آؤ ان کھنڈروں کے ماضی پہ کوئی نظم لکھیں
جانے کس کس نے یہاں خواب سجائے ہوں گے

بھلا غموں سے کہاں ہار جانے والے تھے
ہم آنسوؤں کی طرح مسکرانے والے تھے

ہمیں نے کردیا اعلانِ گمرہی ورنہ
ہمارے پیچھے بہت لوگ آنے والے تھے

انھیں تو خاک میں ملنا ہی تھا کہ میرے تھے
یہ اشک کون سے اونچے گھرانے والے تھے

انھیں قریب نہ ہونے دیا کبھی میں نے
جو دوستی میں حدیں بھول جانے والے تھے

میں جن کو جانکے پہچان بھی نہیں سکتا
کچھ ایسے لوگ مِرا گھر جلانے والے تھے

ہمارا المیہ یہ تھا کہ ہم سفر بھی ہمیں
وہی ملے جو بہت یاد آنے والے تھے

وسیم: کیسی تعلق کی راہ تھی جس میں
وہی ملے جو بہت دل دکھانے والے تھے

اچھا ہے جو ملا وہ کہیں چھوٹتا گیا
مڑ مڑ کے زندگی کی طرف دیکھتا گیا

میں خالی جیب سب کی نگاہوں میں آ گیا
سڑکوں پہ بھیک مانگنے والوں کا کیا گیا

جانا ہی تھا تو جاتا اسے اختیار تھا
جاتے ہوئے یہ بات مجھے کیوں بتا گیا

کیوں مجھ میں ڈھونڈتا ہے وہ پہلا سا اعتبار
جب اس کی زندگی میں کوئی اور آ گیا

اس نے بھی چھوڑ دی مرے بارے میں گفتگو
کچھ دن کے بعد میں بھی اسے بھول سا گیا

میلے کی رونقوں میں بہت گم تو ہو وسیمؔ
گھر لوٹنے کا وقت میاں سر پہ آ گیا

دل میں مندر کا سا ماحول بنا دیتا ہے
کوئی اک شمع سی ہر شام جلا دیتا ہے

زندگی دی ہے تو یہ شرطِ عبادت نہ لگا
پیڑ کا سایہ بھلا پیڑ کو کیا دیتا ہے

تمہیں غموں کا سمجھنا اگر نہ آئے گا
تو میری آنکھ میں آنسو نظر نہ آئے گا

یہ زندگی کا مسافر یہ بیوفا لمحہ
چلا گیا تو کبھی لوٹ کر نہ آئے گا

بنیں گے اونچے مکانوں میں بیٹھ کر نقشے
تو اپنے حصّے میں مٹی کا گھر نہ آئے گا

منا رہے ہیں بہت دن سے جشنِ تشنہ لبی
ہمیں پتہ تھا یہ بادل ادھر نہ آئے گا

لگے گی آگ تو سمتِ سفر نہ دیکھے گی
مکان شہر میں کوئی نظر نہ آئے گا

وسیمؔ اپنے اندھیروں کا خود علاج کرو
کوئی چراغ جلانے ادھر نہ آئے گا

غم کا احساس زمانے کو دلا آیا ہوں
پھول کی پودھ میں کانٹوں میں لگا آیا ہوں

کیوں یہ آوازیں مرا پیچھا کیئے جاتی ہیں
میں تو بستی سے بہت دور چلا آیا ہوں

زندگی ہے اور دلِ نادان ہے
کیا سفر اور کیا سامان ہے

میرے غم کو بھی سمجھ کر دیکھئے
مسکرا دینا بہت آسان ہے

میں نے ہنس ہنس کر گزارا ہے تجھے
زندگی! تجھ پر مِرا احسان ہے

موت کو یوں یاد کرتے ہو وسیمؔ
جیسے مرجانا بہت آسان ہے

کس کو بتائے گا یہاں شام ہے یہ سحر نہیں
جب تیرے اختیار میں تیرا خود اپنا گھر نہیں

چلتی ہوئی ہوا کے اک جھونکے کی ہم سفر بنے
میرے دیئے کی روشنی اتنی بھی کم نظر نہیں

کیسے ہوا کہاں ہوا پیار عجیب چیز تھا
اُس کو بھی کچھ پتہ نہیں مجھ کو بھی کچھ خبر نہیں

آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات تو کر کے دیکھتا
اتنا بھی اعتماد اُسے اپنی نگاہ پر نہیں

ترِی بزم تک تو آؤں جو یہ آنا راس آئے
یہ سنا ہے جو گئے ہیں وہ بہت اُداس آئے

وہ دل آپ مٹ رہیں گے ترِا غم اٹھا نہ جن سے
وہ چراغ کیا جلیں گے جنھیں شب نہ راس آئے

میں شراب پی رہا ہوں مِرے پاس کیسی فرصت
کسی اور وقت غم سے کہو میرے پاس آئے

کبھی اے وسیمؔ پہنچے جو غموں میں مسکرانے
اٹھا شور میکدے میں کہ وہ دیوداس آئے

شبِ مے خانہ بھی جب تجھ پہ گراں گذرے گی
زندگی تو ہی بتادے کہ کہاں گذرے گی

تو نے اک بزم کو روشن تو کیا ہے لیکن
عمر اے شمع تری بن کے دھواں گذرے گی

زندگی تیرے لئے میں نے بہت کچھ کھویا
یہ نہ سمجھا تھا کہ بے نام ونشاں گذرے گی

آج پی لینے دے ساقی مجھے جی لینے دے
کل مِری رات خدا جانے کہاں گذرے گی

اُن سے کہہ دو مجھے خاموش ہی رہنے دیں وسیمؔ
لب پہ آئے گی تو ہر بات گراں گزرے گی

مجھے پوچھنے کا حق دے کہ یہ اہتمام کیوں ہے
مرے ساتھ پیاس کیوں ہے ترے پاس جام کیوں ہے

جسے میری تیرہ بختی سے فروغ مل رہا ہو
وہی صبح پوچھتی ہے مرے گھر میں شام کیوں ہے

تری بے نیازیوں کو کبھی سوچنا پڑے گا
جہاں تیری گفتگو ہے وہاں میرا نام کیوں ہے

یہاں روشنی کا لانا اگر اک گنہ سے کم ہو
تو یہ صبح کے مسیحا پہ صلیبِ شام کیوں ہے

میں وسیم وقت سے بھی ابھی مطمئن نہیں ہوں
مجھے اس سے یہ گلہ ہے کہ یہ سست گام کیوں ہے

تمام عمر بڑے سخت امتحان میں تھا
وہ فاصلہ جو ترے میرے درمیان میں تھا

پروں میں سمٹا تو ٹھوکر میں تھا زمانے کی
اُڑا تو ایک زمانہ مری اُڑان میں تھا

اسی پہ ہو گیا قربان دو دِلوں کا ملاپ
وہ جائداد کا جھگڑا جو خاندان میں تھا

تجھے گنوا کے کئی بار یہ خیال آیا
تری انا ہی میں کچھ تھا نہ میری آن میں تھا

جو تو نہیں تو ترے خواب دیکھنا کیا ہے
ادھورے شہر میں رہنے سے فائدہ کیا ہے

مصیبتوں میں اُبھرتی ہے شخصیت یارو
جو پتھروں سے نہ اُلجھے وہ آئینہ کیا ہے

وہ اپنے چہرے کا لکھا بھی پڑھ نہیں سکتا
ہر اک سے پوچھ رہا ہے مرا پتہ کیا ہے

یہ روشنی کے ارادوں کی بات تھی ورنہ
ہوا کے سامنے ننہا سا اک دیا کیا ہے

ہوا کی تیزی دریچے میں بند کر لیتا
بس اور اس کے سوا جذبۂ وفا کیا ہے

مِری حیات شکستوں پہ سوگوار نہ ہو
کہیں یہ رسمِ ستم ہی ترا سنگھار نہ ہو

اک آرزو کی تباہی کے ذمہ دار نہ ہو
گنہ سے روکنے والو گناہگار نہ ہو

کلی کیطرح اجل دوستوں کی بستی میں
وہ مسکرائے جسے زندگی سے پیار نہ ہو

یہ بار بار تِری سمت ذہن کا جانا
تجھے بھی آج کہیں میرا انتظار نہ ہو

وسیمؔ جینا وہیں تک بہت غنیمت ہے
کہ یہ حیات جہاں تک کسی پہ بار نہ ہو

یہ ستم کا دور تو ہے مگر یہ نہیں کہ اس سے مفر نہیں
کوئی ایسی شام بتایئے جو کہے کہ میری سحر نہیں

اگر اختیار کی لذتیں ہیں بہت عزیز تو عہدِ غم......
وہ دُعا بھی ہونٹوں سے چھین لے جو گناہگارِ اثر نہیں

میں نہ جانے کب سے ہوں فکر میں رہِ زندگی تجھے طے کروں
مگر آج تک مِرے عزم کا ترے فاصلوں پہ اثر نہیں

وہی رسم رازونیاز ہے مگر آج شرطِ وفا لئے
تجھے آزمائش سر نہیں مجھے آزمائش در نہیں

میں غزل کی بزم میں اس لئے بھی اک اجنبی ہوں کہ اے وسیم
مِرے پاس زلفوں کی شب نہیں مِرے پاس رُخ کی سحر نہیں

تمام عمر نہ جڑنے کا غم اُٹھاتے ہیں
وہ اعتبار کے رشتے جو ٹوٹ جاتے ہیں

تم اپنے چہرے کا ہم سے حساب لے لینا
یہ آئینے تو کوئی دن میں ٹوٹ جاتے ہیں

جو ایک پیاس کو پانی نہ دے سکا پھر بھی
اسی کو لوگ سمندر بتائے جاتے ہیں

وسیمؔ رشک سے دیکھوں نہ کیوں پرندوں کو
یہ شام ہوتے گھروں کو تو لوٹ جاتے ہیں

ہمارے ظرف کا یہ امتحان کم نہ ہوا
خوشی کے دور میں رُسوا تمہارا غم نہ ہوا

شکستیں کھاتا رہا اور مسکراتا رہا
میں وہ اُجالا ہوں جو تیرگی سے کم نہ ہوا

شراب گھر میں بھی ساقی سے لے کے ساغر تک
شریک مے تو تھے کوئی شریک غم نہ ہوا

طرح طرح ترے بارے میں سوچ کر دیکھا
مگر کسی بھی طرح اعتبار کم نہ ہوا

تمام کھڑکیاں دروازے کھول ڈالے مگر
گھٹا ہوا تھا جو گھر میں دھواں وہ کم نہ ہوا

تم اپنے شہر کی قیمت کہاں گراؤ گے
مٹانا چاہو گے مجھ کو مٹا نہ پاؤ گے

جلے مکانوں کی چنگاریوں کو ملنے دو
تم اپنی اونچی عمارت بچا نہ پاؤ گے

بس ایک بار سمجھ لو یہی غنیمت ہے
میں وہ نہیں کہ جسے روز آزماؤ گے

بس ایک دو ہی تعلق بہت ہیں جینے کو
بہت سے رشتے بنائے تو ٹوٹ جاؤ گے

اپنے ہر ہر لفظ کا خود آئینہ ہوجاؤنگا
اس کو چھوٹا کہہ کے میں کیسے بڑا ہوجاؤنگا

تم گرانے میں لگے تھے تم نے سوچا ہی نہیں
میں گرا تو مسئلہ بن کر کھڑا ہوجاؤنگا

مجھ کو چلنے دو اکیلا ہے ابھی میرا سفر
راستہ روکا گیا تو قافلہ ہو جاؤنگا

ساری دنیا کی نظر میں ہے مِرا عہدِ وفا
اک ترے کہنے سے کیا میں بے وفا ہو جاؤنگا

ہم صبح ہو کے شام کا سایہ بنے رہے
کیا ہونا چاہئے تھا مگر کیا بنے رہے

کانٹے کا زخم پھول کی صہبا بنے رہے
کیا جانے تم مِرے لئے کیا کیا بنے رہے

راہیں ہماری کتنی الگ تھیں نہ جانے کیوں
تم پھر بھی زندگی کا سہارا بنے رہے

ایک آتے ایک جاتے زمانے کے درمیاں
ہم تھے جو اعتبار کا رشتہ بنے رہے

اس دورِ ناشناس حقیقت میں اے وسیمؔ
کتنے گلاب لالۂ صحرا بنے رہے

میں یہ نہیں کہتا کہ مِرا سر نہ ملے گا
لیکن مِری آنکھوں میں تجھے ڈر نہ ملے گا

سر پرتو بٹھانے کو ہے تیار زمانہ
لیکن ترے رہنے کو یہاں گھر نہ ملے گا

جاتی ہے چلی جائے یہ میخانے کی رونق
کم ظرفوں کے ہاتھوں میں تو ساغر نہ ملے گا

دنیا کی طلب ہے تو قناعت ہی نہ کرنا
قطرے ہی سے خوش ہو تو سمندر نہ ملے گا

سوچتے ہی رہے ساتھ چھوٹے ہوئے
کیسے مل جاتے ہیں لوگ بچھڑے ہوئے

ایک آندھی کا قصہ سناتے رہے
پھول بکھرے ہوئے پیڑ ٹوٹے ہوئے

وقت کی گرد میں وقت ہی رہ گیا
لوگ باتیں ہوئے لوگ قصّے ہوئے

بے سمتی کا موسم سارا منظر پیاسا پیاسا تھا
میں نے ہی آواز تجھے دی تو تو اک سناٹا تھا

ہم دونوں اک پیاس کے مارے خالی خالی بیٹھے تھے
اور ہماری رگ رگ میں اک پاگل دریا بہتا تھا

وہ تو کچے بیروں کی اک گٹھری لے کر نکلی تھی
اس کو کیا معلوم کہ اس بازار میں کیا کیا بکتا تھا

تخاطب میں جو میرے نام کا اعلان ہو جائے
تمہارا کیا بگڑتا ہے مری پہچان ہو جائے

کسی سے کوئی بھی امید رکھنا چھوڑ کر دیکھو
تو یہ رشتہ نبھانا کس قدر آسان ہو جائے

دبائے جانے سے اک موج بے وقعت نہیں ہوتی
یہی خطرہ لگا رہتا ہے کب طوفان ہو جائے

روز سڑکوں پہ لہو یوں جو بکھر جائے گا
راہ گیروں کی طرح کون گذر جائے گا

یہ تو سیلاب ہے ڈھونڈے گا نشیبوں کی زمیں
میرے گھر آنے سے پہلے ترے گھر جائے گا

میں نے چاہا ہے تجھے عام سے انساں کی طرح
تو مرا خواب نہیں ہے جو بکھر جائے گا

دوری ہوئی تو ان سے قریب اور ہم ہوئے
یہ کیسے فاصلے تھے جو بڑھنے سے کم ہوئے

آنسو سپردِ ضبط سپردِ قلم ہوئے
تب جا کے اے وسیمؔ زمانے میں ہم ہوئے

شاید غمِ زمانہ تری جیت ہو گئی......
مدّت ہوئی ان آنکھوں کو بے وجہ نم ہوئے

ترے ساتھ رہنے پہ بس نہیں تجھے بھولنا بھی محال ہے
میں کہاں گذاروں یہ زندگی مرے سامنے یہ سوال ہے

دلِ تشنہ تشنہ یہ بھول جا کہ یہ پالیا وہ گنوا دیا
یہ حیات صرف سوال ہے یہ زمانہ صرف خیال ہے

دلِ شیشۂ ستم آشنا تو شکست کھا کے بکھر گیا
ہو نظر میں آنے پر ناز بھی جہاں ٹوٹنے کا ملال ہے

یہ کون ہے جو ایسے مجھے کھول رہا ہے
مجھ میں ہے مگر مجھ سے الگ بول رہا ہے

رکھ دیتا ہے لا لا کے مقابل نئے سورج
وہ میرے چراغوں سے کہاں بول رہا ہے

معیارِ زمانہ تو کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ......
تو کیسی ترازو میں مجھے تول رہا ہے

شاخ سے ٹوٹ کر جو ہواؤں میں تھے
ایسے پتے مرے خیر خواہوں میں تھے

اس کے تیور سمجھنا بھی آسان نہیں
بات اوروں کی تھی ہم نگاہوں میں تھے

وہ جھوٹ بول رہا تھا بڑے سلیقے سے
میں اعتبار نہ کرتا تو اور کیا کرتا

وہ ایک پُل کی طرح راستے میں حائل تھا
میں اُس کو پار نہ کرتا تو اور کیا کرتا

نہ کوئی شریک چاہے نہ یہ غمگسار مانگے
مِری شام کی خموشی بس اک انتظار مانگے

میں گلاب تو نہیں ہوں مگر اے چمن نصیبو!
مِرا دل بھی پھول جیسے ہی کچھ اختیار مانگے

ترے بے ضرر فرشتوں سے بھری پڑی ہے دنیا
مگر اس جہاں کی رونق تو گناہگار مانگے

کہیں بے زبان خوشبو کو نہ لے اڑیں ہوائیں
ترے جسم کا یہ موسم کوئی پہریدار مانگے

نہ سحر طلب اندھیرا نہ غم آشنا دیا ہے
مری خلوتوں سے پوچھو مجھے تم نے کیا دیا ہے

مری بستیاں نہ دیکھو یہاں وہ مکان بھی ہیں
جنھیں خود نگاہ بانوں نے کھنڈر بنا دیا ہے

وہ مقام جستجو بھی مری زندگی نے دیکھا
جہاں تیری قربتوں نے مجھے فاصلہ دیا ہے

یہ شکستِ زندگی تو میں قبول کر لوں لیکن
یہ خیال ہے کہ تم نے مجھے آسرا دیا ہے

نہ بڑھاؤ بدگمانی کہ وسیمؔ آج اس نے
کوئی مصلحت ہی ہوگی جو تمھیں بھلا دیا ہے

"وسیم کے کلام میں آگہی اور شعور کی تہوں کا جائزہ ہے۔ اور ایسا شعور و آگہی جو کیف و سرور کا گلدستہ ہے۔ یہ اکثر خدوخال سے بلند ہو کر کائنات کی رنگینیوں اور دلکشیوں سے لطف حاصل کرتے ہیں شاعری بھی دراصل وہی شاعری ہے جو اپنے وجود سے ہمیں زندگی کی نزدیک تر چیزوں کا احساس دلاتی ہے۔ وسیم کی شاعری احساس حیات کی احساس افزا شاعری ہے اور اسی آئینۂ احساس میں دور کے عکس نزدیک کے عکس پر چلا کر رہے ہیں، لیکن وسیم ہر عکس کے درمیان مستقل وجود کا احساس دلا رہے ہیں۔

میں چل رہا ہوں کہ چلنا بھی ایک عادت ہے
یہ بھول کر یہ رستہ کہاں کو جائے گا۔"

فراق گورکھپوری

وسیم بریلوی کے مزاج کی پہچان ہے وارفتگی اور وارفتگی پیدا ہوتی ہے عرفان غم سے۔ وسیم شعر کہتے ہیں تو ڈوب کر اور لفظوں کو برتتے ہیں تو ترنم اور روانی کے پیش نظر۔ اسی لیے ان کی شاعری تغزل کا لہجہ اختیار کرتی ہے جو ان کی ذات اور زمانے دونوں سے پیوست ہے۔ وہ روایت سے منحرف ہیں نہ منکر۔ اپنے ذاتی تجربات و احساسات کے لیے جب روایتی سانچوں کو ناکافی پاتے ہیں تو ان کی توسیع بھی کرتے ہیں اور ان میں مناسب اضافے بھی اور اس راہ میں بھی وارفتگی ہی ان کی رہنما ہے۔ بیشک وسیم کے شعر تہہ دار ہیں اور انکی تشریحیں مختلف طرز میں کی جاسکتی ہیں۔ غزل کے رمز و ایما کو وسیم اس انداز سے برتتے ہیں کہ ہر علامت چومکھی ہو جاتی ہے اور اس کی تعبیر مختلف انداز سے کی جاسکتی ہے۔ بڑی بات یہی ہے کہ غزل کا شعر غم کے سہارے نئی بصیرتوں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

جو مجھ میں تجھ میں چلا آرہا ہے صدیوں سے
کہیں حیات اسی فاصلے کے نام نہ ہو

ڈاکٹر محمد حسن